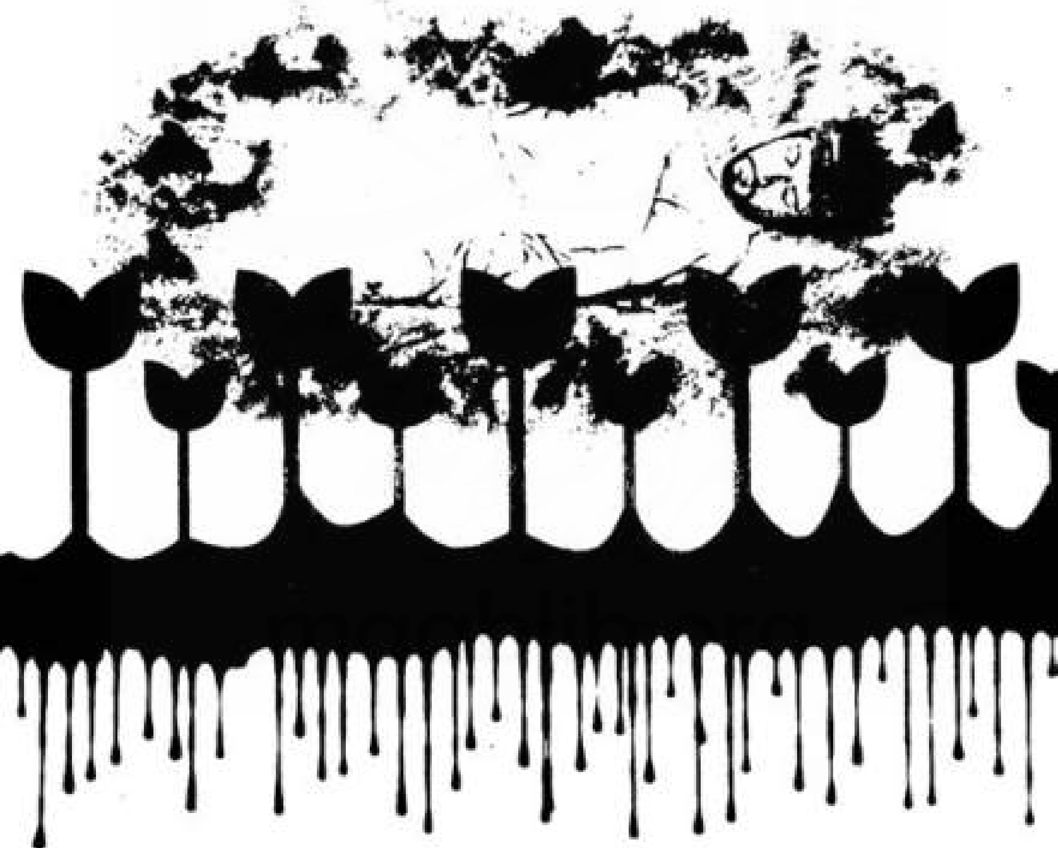
حیاتِ جاوید

استاد مرتضیٰ مطہری شہید



سال نو

اتحاد بین المسلمین

بفرمان رہبر معظم

عالم اسلام کی عظمت و سربلندی کا راز اسکے اتحاد و یکجہتی میں مضمر ہے۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ای

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیات جاوید

استاد مرتضیٰ مطہری شہید



دانش گاہ علوم اسلامی ۔ جی پی او بکس ۱۵، چکوال

رسول خداؐ فرماتے ہیں:

بے شک ہمارا شیعہ وہ ہے جو ہماری پیروی کرے، ہمارے نقش قدم پر چلے اور ہمارے کردار کو اپنائے۔

نام کتاب	حیاتِ جاوید
صاحب اثر	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترتیب وتصحیح	اسد بخاری
ناشر	پیام نور پبلیکیشنز
پرنٹر	الباسط 4268448 - 021-6606211
تاریخ اشاعت	16 فروری 2008 (یوم شہادت شہید عباس موسوی)
تعداد	1000
قیمت	30 روپے
فون	0332-3329235

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کائنات کے متعلق مکتب اسلام کے اصولوں میں ایک ''اصولِ معاد'' ہے۔ جو عقائد اسلامی کا ایک جزو ہے۔ ''معاد حیاتِ اخروی یا زندگی جاوید کا نام ہے۔ اور اس پر ایمان لانا داخل اسلام ہونے کی شرط ہے۔ جو شخص آخرت پر ایمان نہ لائے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوتا ہے۔

تمام پیغمبرانِ خدا نے توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ جس امر کی پُرزور تاکید کی ہے وہ اسی اصول اور جزو عقائد اسلامیہ پر ایمان لانا ہے۔ جسے علم الکلام کے علماء نے ''اصول معاد'' سے موسوم کیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی متعدد آیات میں بعد از مرگ حیات اخروی کا تذکرہ بالتفصیل موجود ہے۔ جن میں قیامت، اعمال انسانی کا حساب کتاب، سزا و جزاء، جنت و جہنم کے ذکر کے ساتھ اس جہان کی ہمیشگی اور جاودانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی بعد از مرگ تمام حالات و مسائل کا بیان قرآن میں موجود ہے۔ مگر بارہ آیات ایسی ہیں جن میں باضابطہ طور پر توحید پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ یوم آخرت کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں قیامت کا ذکر مختلف ناموں سے کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا نام اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ان میں ایک ''یوم الآخر'' ہے۔ درحقیقت اس تعبیر کے وسیلے سے کلام الٰہی دو نقاط سمجھانا چاہتا ہے۔

اوّل یہ کہ حیات انسانی بلکہ تمام کائنات کا سفر دو ادوار میں منقسم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو ''ایک دن'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے پہلا دور یا دن دنیاوی ہے جو آخر کار ختم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا دن جو نا قابل فنا ہے وہ دورِ آخرت ہے۔ اسی طرح سے قرآن مجید میں دور دنیاوی کو ''اولیٰ'' اور دورِ آخرت کو ''یوم آخرت'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

دوم یہ کہ اب جبکہ ہم دورِ دنیوی سے گذر رہے ہیں اور ہماری رسائی دوسرے روز تک

نہیں ہوئی اور نہ ہی ہم اُس سے شناسا ہیں تو ہمارے دونوں دنوں کے لئے باعث سعادت یہی ہے کہ ہم یوم آلاخر پر ایمان لائیں یہ ہمارے اس دن کے لئے باعث سعادت اس لئے ہے کہ ہمارے تمام اعمال ایمان ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس ایمان کے تحت ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے تمام اعمال خواہ ان کی نوعیت حقیر ہو یا اہم دوایام سے منسلک ہیں۔ ایسا نہیں کہ ہم جو اعمال بجالاتے ہیں وہ انجام پاتے ہی ختم ہو جائیں بلکہ یہ سب کچھ دوسرے دور یا دن تک محفوظ رہتا ہے جہاں اسے میزان عمل میں پرکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس یقین کے بعد ہم نیک اعمال کی سعی کریں۔ عیوب اور ناپسندیدہ اعمال سے دوری اختیار کریں اور اس طرح قدم بہ قدم نیکی کا راستہ اختیار کرتے چلے جائیں۔ البتہ ایمان دوسرے دن کے لئے باعث سعادت اس لئے ہے کہ جیسا کہ ہم آئندہ سطور میں بحث کریں گے کہ اس دن کی سعادت و بدبختی کا انحصار بھی روز اول کے اعمال و افعال پر ہے۔ پس انسانی سعادت کے لئے دوسرے دن، دور آخرت یا یوم آلاخر پر ایمان لانا لازمی ہے

اخروی زندگی پر ایمان کیوں؟

اخروی زندگی پر ایمان لانے کا سبب اولیں وحی الٰہی ہے کہ جو مختلف پیغمبروں کے توسط سے ہم تک پہنچتی رہی۔ یعنی انسان نے معرفت خداوند حاصل کرلی، اس کے بھیجے ہوئے پیغمبران پر ایمان لے آیا اور یہ تعین کرلیا وہ (پیغمبران) جو پیغام لاتے ہیں وہ بغیر کسی غلطی اور جھوٹ کی آمیزش یقیناً خدا کی جانب سے ہوتا ہے تو وہ قیامت اور اخروی زندگی پر بھی ایمان لے آیا کیونکہ تمام انبیاء نے توحید کے بعد جس امر کی دعوت پر سب سے زیادہ زور دیا وہ ایمان بالآخرت تھا یعنی اخروی زندگی پر ایمان لانا۔ اس طور سے اخروی زندگی پر ایمان لانا ہر شخص کے لحاظ سے ایک طرف تو نبوت پر ایمان لانے پر منتج ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق فکر انسان کی اپنی سطح پر ہے کہ وہ انسان فکری اعتبار سے کس مقام پر ہے اور کس حد تک معاد اور عالم آخرت کی صحت اور معقولیت کو سمجھ سکتا ہے۔ اور اس کی سوچ کس حد تک جاہلانہ خیالات سے مبرا ہے البتہ وسیلۂ نبوت کے

علاوہ بھی کئی راستے ہیں جن کے ذریعے انسان اخروی زندگی کی حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے اور وہ انسان کی اپنی علمی کاوشیں اور کائنات میں اس کے قرائن و آثار ہیں جو نبوت کی تائید کا بھی سبب بنتے ہیں۔ ان راستوں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ معرفت خدا کا راستہ

۲۔ معرفت کائنات کا راستہ

۳۔ معرفت روح و نفس انسانی کا راستہ

۴۔ وحی اور نبوت کا راستہ

ہمیں اس مقام پر ان تمام راستوں پر بحث کرنا مقصود نہیں کہ ایسا کرنے سے فلسفیانہ بحث کا آغاز ہوگا۔ اس کتاب میں ہم فقط وحی و نبوت کے حوالے سے اس مفہوم کو سمجھانا چاہتے ہیں مگر چونکہ ان راستوں کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہوا ہے اس لئے ہم اخروی زندگی یا دور آخرت کے بارے میں قرآنی دلائل کے ضمن میں ان تین راستوں کا بھی مختصر تذکرہ کریں گے۔

اسلامی نظریہ کے مطابق اخروی زندگی کے عقیدے کی وضاحت کے لئے جن مسائل پر بحث کرنا ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) موت کی حقیقت (۲) زندگی بعد از موت (۳) عالم برزخ (۴) قیامت کبریٰ (۵) دنیاوی دور حیات کا اخروی دور حیات سے تعلق (۶) انسانی اعمال و افعال کا مجسم ہونا (۷) دونوں ادوار حیات کی مشترک اور غیر مشترک باتیں۔ (۸) دوسرے جہان کے بارے میں قرآنی دلائل۔

موت کی حقیقت

موت کیا ہے؟ کیا موت نابودی و نیستی، فنا و انہدام اور عدم کا نام ہے؟ یا تحول، تطور و تغیر، ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک دنیا سے دوسری دنیا کو انتقال کا نام، یہ سوال ہمیشہ سے فکر انسانی کو درپیش ہیں۔ ہر شخص کی خواہش ہے کہ وہ خود اس کا جواب دے یا جو جوابات دیئے

گئے ہیں ان پر ایمان لے آئے۔ ہم مسلمان ہونے اور قرآن پر ایمان رکھنے کے ناطے سے اس سوال کے جواب کے لئے قرآن سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اس کے فراہم کردہ جوابات پر یقین رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس سلسلہ میں ایک مخصوص انداز اپنایا ہے اور موت کے مفہوم کو "تَوَفّي" سے تعبیر کیا ہے۔ توَفی اور استیفا دونوں ایک ہی مادہ سے یعنی "وفا" سے جب کوئی شخص کسی شے کو بغیر کسی کمی وبیشی وصول کرے تو اسے استیفی کہتے ہیں اور اس مفہوم کے بیان کے لئے عربی زبان میں توفی کا لفظ استعمال ہوتا ہے مثلاً "توفیت المال" مراد یہ کہ میں نے مال کو بلا کم وکاست واپس لے لیا۔

قرآن مجید کی ۱۴ آیات میں موت کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ان سب آیات سے یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ موت کسی کے سپرد ہونا ہے یعنی انسان مرتے وقت اپنی ذات اور حقیقت سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نمائندوں کے سپرد کردیتا ہے اور وہ نمائندگان الٰہی اس انسان کو وصول کرلیتے ہیں۔ قرآن مجید کی اس تعبیر سے درج ذیل مطالب نکالے جاسکتے ہیں۔

(ا) موت نیستی، نابودی اور فنا نہیں ہے، بلکہ ایک جہان سے دوسرے جہاں کی طرف انتقال اور ایک طرز زندگی کو چھوڑ کر دوسری کا آغاز ہے۔

(ب) انسان کی حقیقی شخصیت اور حقیقی واقعیت اس کا بدن یا اس سے متعلق اشیاء نہیں کیونکہ اس کا بدن اور اس سے متعلق تمام اشیاء کسی دوسری جگہ مستقل نہیں ہوتیں بلکہ بتدریج اسی دنیا میں ختم ہوجاتی ہیں۔ ہماری حقیقت اور واقعیت جو درحقیقت ہماری اصل ہے قرآن مجید میں سے نفس اور روح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(ج) روح یا نفس انسانی جو ہر انسان کی حقیقی شخصیت کا معیار ہے اور انسان کی

جاویداتی اور ہمیشگی ہے۔ یہ مقام اور رتبہ کے اعتبار سے ایک ایسا وجود ہے جو مادیت سے مافوق ہے۔ روح یا نفس اگرچہ طبیعت کے جوہری تکامل کا ماحصل ہے لیکن یہ فطرت جوہری تکامل کے نتیجے میں روح یا نفس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کا وجود افق، اس کی وجودی جہت، اس کا مرتبہ اور حقیقی مقام بدل جاتا ہے اور بلند سطح پر قائم ہو جاتا ہے یعنی ایک دوسرے عالم ایک اور جہاں کی جنس ہو جاتی ہے کہ جسے عام ماورا کی طبیعت کہتے ہیں، موت کے ساتھ یا موت کی وجہ سے روح یا نفس ایک دور سے دوسرے دور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس روح کی حقیقت سے ہوتا ہے باالفاظ دیگر وہ حقیقت جو مافوق مادہ ہے وہ کسی کے حوالے ہو جاتی ہے قرآن کریم میں کچھ آیتوں میں انسانی خلقت پر بحث کی گئی ہے جو اگرچہ معاد اور اخروی زندگی سے متعلق نہیں ہین لیکن ان میں یہ مطلب واضح کیا گیا ہے کہ انسان ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آب وگل کی ماہیت اور جنس کے علاوہ ہے آدم کے بارے میں پہلے کہا گیا۔

نفخت فیہ من روحی (آیت ۲۹ سورہ حج)

میں نے اپنی روح اس میں پھونک دی۔

روح، نفس اور بعد از موت روح کی بقا معارف اسلامی کے اساسی مسائل اس کے مستقل ہونے اور موت کے بعد اس کی بقا پر قائم ہیں۔ اسی طرح انسانیت، انسان کی واقعی اور حقیقی اقدار بھی اسی حقیقت پر استوار ہیں اور اس کے بغیر سب کچھ وہم وخیال ہے۔

وہ تمام آیات جن میں موت کے بعد بلا فاصلہ زندگی کا ذکر کیا گیا ہے (اُن میں سے چند کا ذکر ہم یہاں کریں گے) وہ سب اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآن کے نزدیک روح بدن سے جدا ایک مستقل حقیقت ہے یعنی وہ بدن سے علاوہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے قرآن بدن کی فنا کے بعد باقی سمجھتا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ قرآن کی رو سے روح اور نفس کا مسئلہ درمیان میں نہیں ہے۔ موت

سے انسان ختم ہو جاتا ہے اور احساس وادراک موت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ قیامت برپا ہوگی اور انسان ایک نئی زندگی حاصل کرے گا۔ فقط اسی وقت ہی انسان اس دُنیا کو اور خود کو دیکھے گا۔

لیکن وہ آیات جو بعد از موت زندگی پر دلالت کرتی ہیں وہ واضح طور سے اس نظریے کو مسترد کر دیتی ہیں۔ درحقیقت یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ وہ لوگ جو کہ روح پر یقین رکھتے ہیں وہ اپنے نظریے کے لئے قرآن کی یہ آیت بطور دلیل نَفَخْتُ فِيْهِ مِنَ الرُّوحِي پیش کرتے ہیں جس میں ارشاد ربانی ہے "قل الروح من امر ربی" ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں روح کا ذکر متعدد بار آیا ہے اور اس سے مراد کچھ اور ہے۔ ان لوگوں نے نَفَخْتُ فِيْهِ مِنَ الرُّوحِي والی یت میں روح کے بھی وہی معنی لئے ہیں جو دوسری آیات سے لئے گئے ہیں۔

لیکن ان بے چاروں کو علم نہیں کہ روح کے قائل افراد کی دلیل فقط یہی آیت نہیں ہے بلکہ بیس اور آیات بھی ہیں۔ دوسری آیات کی مدد سے اسی آیت سے بھی اس مطلب کو ثابت کیا جاسکتا ہے اور وہ اسطرح۔ کہ بعض آیات میں تو لفظ روح بغیر قید کے استعمال ہوا اور بعض دیگر یات میں یہی لفظ قید کے ساتھ استعمال ہوا ہے جیسے "روحنا" "روح القدس" "روحی" روحنا من مرنا وغیرہ۔ انہی میں سے ایک آیت یہ بھی ہے جس میں انسان کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ نفخت فیہ من روحی یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن کی رو سے ایک ایسی حقیقت کا وجود ہے جو فرشتوں اور انسان سے برتر ہے اور اسی کا نام ہے روح فرشتوں اور نسانوں کی امری حقیقت یعنی ان کی روح اذنِ ربی کا ایک فیض ہے۔ وہ تمام قرآنی آیات جن میں روح کا ذکر ہے جب انہیں "نفخت فیہ من روحی" والی آیت سے ملائیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ روح ایک غیر مادی حقیقت ہے۔

نہ صرف قرآن مجید نے متعدد آیات میں روح کے ایک علیحدہ وجود رکھنے کی تائید کی

ہے بلکہ (۱) تفسیر المیزان عربی متن جلد ۱۳ ص ۱۹۵ ''قل الرّوح من امر ربّی اور جلد ۲ ص ۲۷۵ و ۲۷۰ یوم یقوم الروح والملائکۃ صفاً کے ذیل میں رجوع کریں۔ احادیث کتب دعا اور نہج البلاغہ میں رسول کریم اور آئمہ اطہار کے اقوال بھی اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ روح سے انکار در حقیقت ایک مغربی ڈھکوسلا ہے جس کا سرچشمہ مغرب کی مادیت پرستی اور دنیاوی حیات پر انحصار ہے یہ امر افسوسناک ہے کہ بعض لوگ حسن نیت سے مغربیوں کے اس نظریے کی تائید کے لئے قرآن سے متمسک ہوئے ہیں۔

اب ہم مثال کے لئے چند ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن میں لفظ ''توفی'' کا ذکر ہے جن میں سے بعض میں بعد از مرگ اعمال، مکالمہ، آرزو، خواہش، گفتگو کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں سے تین آیات ایسی ہیں جن میں ''توفی'' استعمال ہوا ہے۔

ان الذین توفیھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالو افیم کنتم ؟ قالو اکنا مستضعفین فی الارض. قالوا الم تکن ارض اللّٰہ واسعۃ فتھا جروافیھا؟ فاولٰئک ماویھم جھنم وسیاء ت مصیرا . (سورۃ النساء ۹۷)

وہ لوگ جو خود پر ظلم کرتے تھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے معین فرشتوں نے انہیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ فرشتوں نے ان سے پوچھا کہ تم کیسے زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہوں نے جواباً کہا کہ ہم لوگ محروم، کمزور اور ماحول کے زیر اثر تھے۔ فرشتوں نے ان سے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم وہاں کوچ کر جاتے پس ان کی جگہ جہنم اور ان کا انجام بد ہے۔''

یہ آیت ان لوگون کے لئے ہے جو ایک غیر مناسب موحول میں زندگی بسر کر رہے تھے اور ماحول کے مختار دوسرے لوگ تھے اور یہ لوگ اپنے موحول کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہم کیا کریں موحول ہی خراب ہے۔ ناسازگار حالات میں ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طور عذر تراشی کیا کرتے تھے۔ بجائے اس کے کہ یہ ماحول کو بدلنے کی سعی کرتے اگر یہ لوگ

ایسا کرنے پر قدرت نہ رکھتے تھے تو اس ماحول سے نکل جاتے اور مناسب اور بہتر ماحول میں زندگی بسر کرتے اسی فاسد معاشرے میں رہ کر اسے برداشت کرتے رہے اور ماحول کے فساد میں غرق ہوتے چلے گئے تو جب فرشتوں نے ان کی ارواح قبض کیں تو دوران گفتگو ان کے تمام دلائل رد کر دیئے کہ وہ کم از کم اس ماحول سے ہجرت تو کر سکتے تھے۔ اس طرح فرشتوں نے انہیں باور کروایا کہ تم اپنے تمام اعمال کے خود ذمہ دار ہو۔ قرآن مجید کا اس آیت سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ ایک ماحول میں ہماری کمزوری اور ناتوانی، اس صورت میں ہمارے لئے عذر بن سکتی ہے جب اس ماحول کو ترک کرنا ناممکن ہو جائے۔

اسی طرح اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ موت جسے ہم نابود ہونا سمجھتے ہیں پروردگار نے اسے "توفی" سے تعبیر کیا ہے جس سے مراد وصول کرنا یا لے لینا ہے لہٰذا جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں باقاعدہ طور سے اس کے بعد فرشتوں اور انسان کے مابین دلائل اور گفتگو کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ واضح رہے کہ اگر موت سے انسان کی حقیقت ختم ہو جاتی اور وہ محض بے حس اور بے شعور بت رہ جاتا تو اس سے فرشتوں کی گفتگو یقیناً مہمل اور بے معنی سی بات تھی۔ اس آیت سے علم ہوتا ہے کہ انسان جب اس جہاں سے رخصت ہو جاتا ہے وہ انسان تو حواس خمسہ سے محسوس نہ کی جانے والی موجودات (فرشتوں) سے ہمکلام ہو جاتا ہے۔

دوسری آیت: وقالو .... الی آخر (سورہ سجدہ آیت ۱۰، ۱۱)

ترجمہ: اور انہوں نے کہا کہ جب زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا پھر ہم نئی زندگی حاصل کر لیں گے (یہ گفتگو اک بہانہ ہے) حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لوگ (بغض وعناد کے باعث) اپنے پروردگار کے منکر ہیں آپ اُن سے فرما دیجئے۔ وہی موت کا فرشتہ جو تم پر مؤکل ہے۔ موت کے وقت تمہیں پورا پورا دریافت کر لے گا اس کے بعد تم خدا کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

اس آیت میں قرآن مجید نے معاد اور اخروی زندگی کے منکروں کے شبہات میں سے

ایک کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی جواب بھی دیا ہے۔

اس مقام پر ان کا شبہ اور اشکال یہ ہے کہ مرنے کے بعد ہمارا ذرہ ذرہ فنا ہو جاتا ہے اور ہمارا نشان تک باقی نہیں رہتا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ایک نئی زندگی حاصل کر سکیں۔ قرآن مجید میں پہلے اس شبہ کے بارے میں بڑے خوبصورت انداز میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ تمہارا یہ شبہ حقیقت میں بغض وعناد پر مبنی ہے۔ اور بہانہ سازی کے سوا کچھ بھی نہیں اور بعد میں ارشاد ہوتا ہے کہ تمہاری حقیقت وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو اور جو ختم ہو جائے گی تم تو اپنی حقیقت اور مکمل شخصیت سمیت خدا کے معین کردہ ایک فرشتے کے سپرد ہو جاؤ گے۔ شبے کے شکار لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم ختم ہو جائیں گے اور جب ہمارے بدن کا ہر ذرہ نیست و نابود ہو جائے گا تو ہمارے بدن کا دوبارہ زندہ ہو جانا کس طرح ممکن ہے۔ بعینہٖ یہی شبہ یعنی بدن کے اجزاء کا ذرہ ہو کر بکھر جانا اور کھو جانا قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی مذکور ہے اور وہاں اس کا جواب بھی دیا گیا ہے کہ بدن کے گمشدہ ریزے ریزے کو پھر اسی شکل میں مجتمع کرنا بشر کے لئے تو ناممکن ہے مگر کیا خدا کی لامتناہی ہی ذات اور قدرت کے لئے بھی ایسا کرنا ممکن نہیں؟ ان مذکورہ آیات میں ان انکار کرنے والوں کی بات براہ راست بدن کے اجزاء کے متعلق ہے کہ یہ کس طرح اور کہاں اکٹھے ہوں گے

لیکن جو آیت ہم نے پیش کی ہے۔ اس میں جواب مختلف طریقہ سے دیا گیا ہے کیونکہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ بدن کا ہر حصہ ایک مقام پر گر جاتا ہے اور اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا یعنی گفتگو اس مقام پر ہے کہ بدن کے اجزاء کی گمشدگی سے ہم خود بھی گم ہو جاتے ہیں اور ہم میں "میں" نام کی کسی چیز کا وجود باقی نہیں رہتا۔ دوسرے لفظوں میں شبہ رکھنے والوں کا اصل کہنا یہ ہے کہ جب ہمارے بدن کے اجزاء متفرق ہو جائیں گے تو ہماری اصلیت و شخصیت کا لانیست و نابود ہو جائے گی قرآن پاک ان کے اس وہم کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہماری شخصیت کبھی گم نہیں ہوتی کہ اسے تلاش کرنا پڑے وہ پہلے ہی ہمارے معین فرشتے کے دست اختیار میں ہے۔ یہ

آیت واضح طور سے بعد از مرگ بدن کے فنا کے باوجود حقیقی شخصیت کی بقا کی جانب راہنمائی کرتی ہے۔

آیت نمبر ۳

اللّٰہ یتوفی الانفس حین موتھا والّتی لم تمت فی منامھا فیمسک الّتی قضی علیھا الموت ویرسل الأخری الیٰ اجل مسمّی ان فی ذٰلک لاٰیت لقوم یتفکرون . (سورہ زمر آیت ۴۲)

ترجمہ:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نفوس کو موت کے وقت اور وہ لوگ جو مرے نہیں بلکہ نیند میں ہیں ان کو مکمل طور پر وصول کر لیتا ہے (واپس لے لیتا ہے اپنے پاس بلا لیتا ہے) پھر وہ لوگ جن کی اجل آچکی ہے ان کو تو اپنے پاس رکھ لیتا ہے، اور دوسروں کو معینہ مدت کے بعد واپس بھیج دیتا ہے۔

اس آیت میں موت کو سونے اور اخروی زندگی کو بیداری سے تعبیر کیا گیا ہے درحقیقت نیند ایک ضعیف وصغیر موت ہے اور موت ایک بڑی اور طویل نیند دونوں ہی صورتوں میں انسانی روح ایک زندگی سے دوسری زندگی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے نیند کی حالت میں انسان عموماً غافل ہوتا ہے۔ اور بیداری پر وہ اس جانب متوجہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک سفر سے لوٹ کر آیا ہے موت اس کے برعکس ہے اس میں سب کچھ اس پر واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔

یہ تینوں آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ قرآن کی رو سے موت نابودی اور نیستی کا نام نہیں بلکہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونا ہے۔

اس ضمن میں قرآن کی رو سے نیند کی حقیقت بھی روشن ہوگئی ہے اور یہ علم ہو گیا ہے کہ نیند کے عالم میں ظاہری اور جسمانی اعتبار سے طبیعت اور فطرت کے تمام قواء معطل ہو جاتے ہیں لیکن نفس و روح کے حوالے سے یہ ایک قسم کا باطن اور عالم ملکوں کی طرف رجوع ہے۔ موت کی طرح سے نیند کا مسئلہ بھی علم مجہولات میں سے ہے۔

اس ضمن میں سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ جسمانی خلیات کی حرکات ہیں جو بدن میں جنم لیتے رہتے ہیں۔

بعدازمرگ

کیا مرنے کے فوراً بعد انسان قیامت میں پہنچ جاتا ہے اور تمام معاملات ختم ہو جاتے ہیں یا ایسا نہیں بلکہ مرنے کے بعد انسان قیامت تک ایک فاصلہ طے کرتا ہے اور جب قیامت کبریٰ کا وقوع ہوگا تب وہ قیامت میں وارد ہوگا (البتہ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ قیامت کبریٰ کا علم فقط اللہ ہی کو ہے حتیٰ کہ خود انبیا نے بھی اس روز کے تعین کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ ہمیں قرآنی آیات، احادیث نبویؐ اور ارشادات آئمہ طاہرین کے استفادہ سے جو علم ہوتا ہے اس کے مطابق کوئی ایک بھی بلا فاصلہ بعدازموت قیامت کبریٰ میں وارد نہیں ہوگا کیونکہ قیامت کبریٰ میں ان تمام موجودات کہ جن کا ہمیں علم ہے مکمل طور۔ الٹ پلٹ جانے اور تغیر و تبدل کا شکار ہونے کا نام ہے۔ یعنی بحروبر، کوہ وجبل آفتاب و ماہتاب نجوم و شمسی نظامات سب میں تغیر واقع ہو جائیگا اس کے علاوہ قیامت کبریٰ میں ازل سے لے کر ابد تک کی تمام موجودات مجتمع ہوں گی مگر اب ہمارے سامنے ہے کہ نظام کائنات برقرار ہے اور شاید مزید اربوں، کھربوں سال یہ نظام برقرار رہے اور ان گنت انسان اور وجود میں آئیں۔

کلام پاک اسی طرح ہماری یہ راہنمائی بھی کرتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان خاموشی اور بے حسی کا شکار نہیں ہو جاتا یعنی ایسا ہرگز نہیں کہ انسان اپنا احساس کھو بیٹھے اور ہر طرح کے محسوسات سے عاری ہو جائے بلکہ مرنے کے بعد انسان زندگی کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے حواس برقرار رہتے ہیں اور اس زندگی کی طرح وہ لذت و تکلیف جیسے محسوسات رکھتا ہے۔ اور اس کے حواس کی یہ کیفیت قبل ازمرگ اور بعد ازمرگ سے لے کر قیامت کبریٰ کے واقع ہونے تک برقرار رہے گی اور پھر قیامت کبریٰ کے وقوع پر ہر شے میں

ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہوگا اور یہ انقلاب ایک حقیر زمینی ذرے سے لے کر کائنات میں موجود ہر خلقت میں رونما ہوگا اور اس وقت قبل از مرگ کی دنیا سے لے کر قیامت کبریٰ تک کا فاصلہ اختتام پذیر ہو جائے گا یعنی قرآن مجید کی رو سے بعد از مرگ کا عالم دو مراحل میں رونما ہوگا یعنی موت کے بعد انسان دو مراحل طے کرے گا پہلا مرحلہ جس کا نام عالم برزخ ہے وہ اس دنیا کی طرح فانی ہے جبکہ دوسرا مرحلہ جو عالم قیامت کبریٰ ہوگا وہ ناقابل اختتام اور ہمیشہ کے لئے قائم ودائم رہے گا۔

اور اب ہم اپنے دو عالموں یعنی عالم برزخ اور عالم قیامت پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

عالم برزخ

دو اشیاء کے مابین واقع شے کو برزخ کہتے ہیں قرآن مجید نے بعد از مرگ اور قیامت کبریٰ سے قبل عرصہ حیات کو برزخ سے تعبیر کیا ہے سورۃ المومنون کی آیت ۱۰۰ میں ارشاد ہے۔

اذا جاء احدهم الموت قال رب ارجعونی لعلی اعمل صالحاً فی ما ترکت انها کلمه هو قائلها ومن وراء هم برذخ الی یوم یبعثون .

ترجمہ:۔ جس وقت ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو وہ کہے گا میرے پروردگار مجھے واپس لوٹا دے تا کہ واپس جا کر وہ اچھے اعمال جو میں انجام نہیں دے سکا ان کو انجام دے سکوں قطعاً نہیں۔ یہ صرف وہی گفتگو ہے جو وہ کرتا ہے۔ ان کے سامنے (یعنی مرنے کے بعد) مبعوث ہونے کے دن تک برزخ اور فاصلہ ہے۔

یہ واحد ایسی آیت ہے جس میں بعد از مرگ قیامت تک کے عرصہ کو برزخ اور فاصلہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور علمائے اسلام نے اسی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے پس از مرگ اور قبل از قیامت کبریٰ کے عالم کو برزخ کا نام دیا ہے۔

اس آیت میں بعد از مرگ انسانی زندگی کے برقرار رہنے کے متعلق اس قدر ہی ذکر کیا

ہے کہ یہ لوگ موت کے بعد اپنے اعمال پر پشیمان ہوں گے اور دوبارہ قبل از مرگ کے عالم میں آنے کی خواہش کریں گے اور ان کی یہ خواہش مسترد کردی جائے گی۔

اس آیت میں بڑی وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک قسم کی زندگی عطا ہوگی تب ہی تو وہ واپس لوٹائے جانے کی درخواست کرے گا لیکن پروردگار اس کی یہ درخواست رد کردے گا۔

قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں موت اور قیامت کے درمیانی فاصلہ میں رنج وغم، لذت ولطف، آرام، بدبختی وخوش بختی جیسے احساسات انسانی کا تذکرہ موجود ہے۔ یعنی بعض انسان ایسے ہیں جنہیں خوشحال زندگی سے نوازا جائے گا اور بعض تکالیف میں انتہائی نامساعد حالات میں زندگی گذاریں گے۔ مجموعی طور پر قرآن مجید کی پندرہ آیات میں بعد از مرگ اور قبل از قیامت کبریٰ کی زندگی کی کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان تمام آیات میں نشاندھی کی گئی ہے کہ انسان اس عالم میں ایک مکمل زندگی سے نبرد آزما ہوگا۔

ان آیات کی چند اقسام ہیں۔

۱۔ وہ آیات جن میں نیکوکار، بدکار انسانوں اور فرشتوں کی گفتگو اور مکالمے موجود ہیں اس نوع کی آیات میں بہت سی ہیں۔ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۷ اور سورہ مومنوں کی آیت نمبر ۱۰۰ اسی قسم کی آیات میں سے ہیں جن کا ترجمہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

۲۔ مندرجہ بالا مفہوم کے علاوہ ایسی آیات بھی ہیں جن میں فرشتے گفتگو کے بعد نیک اور صالح افراد کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی نوید دیں گے یعنی فرشتے انہیں قیامت کبریٰ تک انتظار نہیں کرائیں گے۔ درج ذیل دو آیات اسی مفہوم کی ہیں۔

الذین یتوفٰهم الملائکة طیبین یقولون سلام علیکم

ادخلوا الجنه بما کنتم تعلمون . (سورہ نحل آیت ۳۲)

ترجمہ:۔ وہ لوگ جو نیک اور پاکیزہ ہیں فرشتے انہیں وصول کرتے ہی ان سے کہیں گے تم پر رحمت ہو اور اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

قیل ادخل الجنة قال یلیت قومی یعلمون بماغفرلی

ربّی وجعلنی من المکرمین ۔ (سورہ یٰسین آیت ۲۶،۲۷)

ترجمہ:۔ موت کے بعد اسے کہا گیا! جنت میں داخل ہو جا اس نے کہا کاش وہ لوگ جنہوں نے اس بات کو نہیں سمجھا وہ یہ جان لیتے کہ میرے پروردگار نے کس طرح مجھے بخش دیا اور مجھے اپنے مکرم ومحترم بندوں میں شامل کر لیا۔

اس آیت سے قبل چند آیتوں میں اس مومن کی گفتگو اور مکالمہ ہے جس نے اپنی قوم کو ان رسولوں کی اطاعت و پیروی کی دعوت دی جو انطاکیہ شہر میں لوگوں کو غیر خدا کی پوجا پاٹ چھوڑنے اور ایک خدا کی عبادت واطاعت کی دعوت دیتے تھے اور بعد میں وہ شخص اپنے ایمان اور عقیدہ کا اظہار کرتا ہے اور ان سے یہ خواہش کرتا ہے کہ وہ اس کی بات سنیں اور اسی راستے پر گامزن ہوں جس پر وہ خود ہے ان آیات میں قرآن مجید کہتا ہے۔

"لیکن ان لوگوں نے اس کی بات کو نہ سنا یہاں تک کہ وہ دوسرے عالم میں چلا گیا دوسرے عالم میں جب اس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بخششوں، کرامتوں اور نعمتوں کا مشاہدہ کیا تو اس نے یہ آرزو کی کہ کاش میری قوم اس عام میں میری اس خوشحالی اور سعادت مند زندگی سے آگاہ ہو جاتی ۔ بڑا واضح ہے کہ ان تمام واقعات کا تعلق قیامت کبریٰ سے پہلے کے عالم سے ہے۔ کیونکہ قیامت کبریٰ میں تو اوّل وآخر تمام مخلوقات ایک جگہ جمع ہوں گی ۔ کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہے گا کہ جس کے متعلق اس نوع کی خواہش کا اظہار کیا جائے۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی سمجھ میں آئی کہ نیک افراد کے لئے فقط ایک ہی بہشت نہیں خلق کی گئی بلکہ کئی طرح کی بہشتیں بنائی گئی ہیں۔ قرب الٰہی کے مراتب کے اعتبار سے آخرت کی

بہشتیں ان کے علاوہ ہیں جیسا اہلبیت علیہم السلام کی روایت میں ہے کہ بعض بہشتیں صرف عالم برزخ سے متعلق ہیں لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں جس بہشت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ قیامت سے متعلق ہے۔

۳۔ تیسری نوع کی آیات میں فرشتوں اور انسانوں کی گفتگو کے بجائے براہ راست نیکوکار اور سعادت مند انسانوں کے نعمت ہائے خداوندی سے استفادہ کرنے ور بدکار بدبخت انسانوں کا عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے یعنی ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ نیک انسان قیامت اور موت کے درمیانی عرصہ میں نعمتوں سے سرفراز اور خوشحال ہوں گے اور بدکار و گنہگار انسان اس عرصہ میں عذاب دکھ اور درد میں مبتلا رہیں گے۔ درج ذیل دو آیات اس مفہوم کی ترجمان ہیں۔

ولا تحسبن الّذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتا، بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما آتیھم اللّٰہ من فضلہ ویستبشرون بالّذین لم یلحقوا بھم الاخوف علیھم ولاھم یحزنون . (سورۃ آل عمران آیات ۱۶۹۔۱۷۰)

ترجمہ:۔ جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت سمجھو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور اپنے رب سے روزی پاتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و برکت عطا کی ہے اس سے خوش ہیں اور وہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ اپنی دنیا کے دوستوں کو اس شہادت کی بشارت پہنچائیں تاکہ وہ ان کو اپنے ساتھ شہادت میں شریک دیکھیں۔

ایک اور جگہ سورہ مومن آیت ۴۵، ۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے

ترجمہ:۔ فرعونیوں کو آگ اور تکلیف دہ عذاب نے گھیر لیا جو عذاب انہیں صبح و شام دیا جاتا ہے۔ جس وقت قیامت برپا ہوگی (تو انہیں کہا جائے گا) فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کردو۔

یہ آیت مجیدہ فرعونیوں کے لئے دو قسم کے عذاب کا ذکر کررہی ہے۔ ایک عذاب قبل

از قیامت جسے سوء العذاب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جس میں انہیں دو دفعہ آگ پر سے بغیر اندر ڈالے گذارا جائے گا۔ دوسرا عذاب قیامت کے بعد ہے جسے اشد العذاب (شدید ترین عذاب) کہا گیا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ انہیں آگ میں ڈال دو۔ لیکن اس حکم کے ساتھ پہلے عذاب کی طرح وقت یعنی صبح و شام کا ذکر نہیں۔

جیسا کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے اس آیت کی وضاحت و تفسیر میں فرمایا ہے کہ پہلا عذاب عالم برزخ سے متعلق ہے اور عالم برزخ میں عالم دنیا کی مانند صبح و شام ہفتہ و مہینہ سال ہوتے ہیں دوسرے عذاب کے برعکس جو کہ عالم قیامت سے مربوط ہے یہاں وقت ہفتہ مہینہ و سال جیسی اکائیوں میں منقسم نہیں اب ملاحظہ فرمایئے وہ روایات و احادیث جن میں رسول اکرمؐ امیر المومنینؑ اور دیگر آئمہ اطہار نے عالم برزخ کے متعلق مفصل بیان دیا ہے۔

جنگ بدر کے موقع پر اہل اسلام کی فتح اور قریش کے مغرور سرداروں کے ایک گروہ کی ہلاکت پر رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ ان مغرور سرداروں کے اجسام کو ایک کنویں میں پھینک دیا جائے۔ اور اس مرحلہ کے طے ہونے کے بعد آپؐ نے کنویں کی طرف رخ کرتے ہوئے فرمایا خدا نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا ہم نیا سے ویسا پایا کیا تم نے بھی خدا کے سچے وعدوں کو پورا پایا اس موقع پر بعض اصحاب نے کہا یا رسول آپ ہلاک ہونے والوں اور مردوں سے باتیں کر رہے ہیں کیا یہ آپ کی باتیں سمجھ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ انہیں اب تم سے زیادہ سننے کی قوت ہے۔

اس حدیث اور اس قسم کی دیگر احادیث کی رو سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مرنے کے بعد جسم و جان میں جدائی ہو جاتی ہے مگر روح جو کئی سالوں سے بدن کے ساتھ منسلک اور ہمراہ تھی وہ بدن سے اپنا تعلق بالکل ختم نہیں کر لیتی۔

امام حسین علیہ السلام نے روز عاشورہ اپنے اصحاب کے ہمراہ نماز فجر کی ادائگی کے بعد ایک مختصر خطاب میں فرمایا تھوڑے سے صبر اور پامردی سے کام لو موت تمہارے لئے ایک

ایسے پُل کی مانند ہے جو درد و غم، رنج و تکالیف، سعادت و کرامت اور وسیع و عریض بہشتوں کے درمیان قائم ہے جسے تم نے عبور کرنا ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ لوگ سوئے ہوئے ہیں جونہی وہ مریں گے بیدار ہو جائیں گے۔ اس حدیث سے مراد یہ کہ بعد از مرگ زندگی قبل از مرگ زندگی سے مکمل بالاتر ہے جیسے انسان عالم خواب میں نیم زندہ و نیم مردہ سی کیفیت میں ہوتا ہے اور نہایت ضعیف حس کا مالک ہوتا ہے لیکن جب بیدار ہوتا ہے تو اس کی زندگی کامل تر ہو جاتی ہے بعینہ انسان کی دنیاوی زندگی کی کیفیت عالم برزخ کی زندگی سے ضعیف ہے جب وہ عالم برزخ میں پہنچتا ہے تو اس کی زندگی دنیاوی زندگی سے کامل ہو جاتی ہے یعنی اس کی بیداری مستحکم ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر دو نکات کی جانب اشارہ ضروری ہے۔

(ا) دینی راہنماؤں کی روایات اور اخبار سے علم ہوتا ہے کہ علم برزخ میں انسان سے فقط ان مسائل کے بارے میں بازپرس ہوگی جن کا وہ عقیدہ رکھتا تھا اور جن پر اس کا ایمان تھا اور دیگر مسائل کے بارے میں مفصل بازپرس روز قیامت ہوگی۔

(ب) مردہ افراد کے پسماندگان کے تمام نیک کام جو وہ ان کی نسبت سے کریں ان کا اجر و ثواب مردوں کے لئے باعث سعادت ہوگا اسی طور سے عام صدقات ہیں مثلاً صدقہ جاریہ (یعنی ایسے خیراتی اداروں کا قیام جس سے خلقت خدا کو فائدہ پہنچتا ہو) یا صدقات غیر جاریہ یعنی جز وقتی اعمال اگر اس نیت سے کئے جائیں کہ ان کا ثواب ان کے مرحوم اقرباء کو پہنچے تو یہ واقعی مرحومین کی خوشی اور شادمانی کا باعث ہوتے ہیں اسی طرح مرحومین کے لئے دعا کرنا طلب مغفرت کرنا اسی طرح حج و زیارت وغیرہ جو ان کے نام سے کئے جائیں ان کے لئے راحت کا سبب بنتے ہیں۔

اگر اولاد اپنے والدین کو ان کی حیات میں ناراض کر دے اور وہ (والدین) اسی عالم

میں اس دنیا سے چلے جائیں تو وہ ایسے اعمال کے ذریعے ان کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ جنھیں ان کے مرنے کے بعد انجام دیں گے۔

قیامت کبریٰ

حیات جاوید کا دوسرا مرحلہ قیامت کبریٰ ہے۔ قیامت کبریٰ عالم برزخ کے برعکس اجتماعی صورت میں واقع ہوگی کیونکہ عالم برزخ میں زندگی کی حیثیت انفرادی تھی۔ یعنی قیامت کبریٰ میں تمام افراد اور کائنات بیک وقت موجود ہوگی۔ یہ واقعہ عالمگیر ہوگا اور اس کے اثرات تمام کائنات کی ہر حقیر و کبیر خلقت پر مرتب ہوں گے تمام کائنات ایک نئے مرحلے، ایک نئی زندگی اور ایک نئے نظام میں داخل ہوگی۔ قیامت کے بارے میں قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا حادثہ ہوگا جس میں تمام ستارے ٹوٹ جائیں گے سورج اپنی توانائی کھو بیٹھے گا، سمندر خشک ہو جائیں گے۔ میدان ٹیلوں میں اور ٹیلے میدانوں میں بدل جائیں گے۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے پوری کائنات لرزہ بہ اندام اور تغیر و تبدل کا شکار ہوگی۔ ایسی عظیم تبدیلیاں واقع ہوں گی کہ اس سے قبل جن کی نظیر نہ ملتی ہوگی۔ پوری کائنات تباہی اور بربادی کے نیچے ہوگی سب کچھ نیست و نابود ہو جائے گا اور کائنات پھر نئے سرے سے وجود میں آئے گی۔ ایک نیا جنم ہوگا جس کے قوانین اور نظام بھی نئے ہوں گے جو موجودہ نظاموں اور قوانین سے یکسر مختلف ہوں گے اور یہ قوانین ہمیشگی کی خصوصیت رکھتے ہوں گے۔

قرآن کریم میں قیامت کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر نام ایک مخصوص کیفیت اور نظام کا آئینہ دار ہے۔ مثلاً چونکہ اس روز تمام اول و آخر کا اجتماع ہوگا اس حوالے سے اسے ''روز حشر'' یا ''روز جمع'' (ملاقات کا روز) کا نام دیا گیا ہے اُس روز پوشیدہ راز عیاں ہوں گے حقائق کھل کر سامنے آئیں گے۔ اس لحاظ سے اسے یوم تبلی السرائر (جس روز پوشیدہ چیزیں ظاہر ہو جائیں گی) کہا گیا ہے۔ اور روز ''منشور'' کا نام دیا گیا ہے ہمیشہ کے لئے

باقی رہنے کے حوالے سے ''یوم الخلود'' انسانوں کی حیرت وحسرت وپشیمانی کے حوالے سے ان کے آج کے لئے تیار نہ ہونے پر پچھتاوے کے حوالے سے ''یوم الحسرۃ'' یا ''یوم التغابن'' بڑے بڑے حادثات اور واقعات کے حوالے سے نبا العظیم کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اس جہان کی زندگی کا آپس میں ربط و تعلق

آسمانی کتاب نے ہماری توجہ جس انتہائی عمدہ اور بنیادی مطلب کی طرف مبذول کروائی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں زندگیاں آپس میں مربوط ہیں، جدا نہیں۔ اور اخروی زندگی کی کلید انسانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس طرح کہ انسان اپنی اخروی زندگی کا انجام اپنی دنیاوی زندگی میں متعین کرتا ہے۔

سچا ایمان، حقیقت پر مبنی پاکیزہ عقیدہ، اخلاق حسنہ، بغض وحسد مکر وفریب اور بے سود شور وغوغا کی آلائشوں سے مبرا زندگی اور انفرادی شخصیت کی تعمیر کے ساتھ معاشرتی زندگی کے نیک اعمال انسان کی زندگی کو جاودانی اور ہمیشگی بخشتے ہیں جبکہ اسکے برعکس بے ایمانیاں، بدعقیدگی، فریب دہی، خود پسندی، من مانی ظلم وستم ریاکاری وسود خوری، خیانت، غیبت، فتنہ انگیزی، حقیقی معبود کی اطاعت وعبادت سے گریز اور اسی قبیل کی دیگر بداعمالیاں عالم آخرت میں انسان کی بدبختی اور بدحالی کا سبب بنتے ہیں۔

رسولؐ نے ایک بیان میں اس مفہوم کو بڑے احسن طریق سے سمجھایا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:۔

ترجمہ:۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو اس کھیتی میں بوؤ گے آخرت میں وہی کاٹو گے۔

جس طور سے یہ ممکن نہیں کہ انسان جو کاشت کرے اور گندم کاٹنے کی امید رکھے یا خاردار جھاڑیوں کی کاشت کرے اور خوشبودار پھولوں کی امید لگائے یا حنظل کی کاشت سے کھجور کے سرسبز درخت کی امید رکھے اسی طور سے دنیاوی زندگی میں برے اخلاق، بداعمالیوں اور برے

افکار میں جتلا رہ کر آخرت میں اچھے پھل کی امید رکھنا بھی خیال خام ہے۔

جناب امیر المومنین علیہ السلام نے بھی اپنے ایک فرمان میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑا احمق وہ ہے جو برے اعمال کرے اور جنت کی امید رکھے

انسانی اعمال ومکتسبات کا دوام اور مجسم ہونا

قرآن کریم اور دینی راہنماؤں کی احادیث وروایات سے اس امر کا علم ہوتا ہے کہ فقط انسان ہی باقی اور ہمیشہ رہنے والا نہیں بلکہ اس سے سرزد ہونے والے افعال واعمال بھی پوری طرح محفوظ رہتے ہیں یہ ہرگز ختم نہیں ہوتے۔بروز قیامت انسان اپنے کئے ہوئے اعمال کو مجسم ومتشکل دیکھے گا اچھے اعمال لذت آمیز اور خوبصورت اشکال میں اس کے سامنے آئیں گے جنہیں دیکھ کر وہ پھولا نہیں سمائے گا جبکہ برے اعمال وحشت ناک، ڈراؤنی اور کریہہ شکلوں میں آکر اسے درد ورنج میں جتلا کریں گے۔اس مقام پر ہم قرآن مجید کی تین آیات اور دو احادیث نبوی پر اکتفا کرتے ہیں۔

آیات قرآنی

یوم تجد کل نفس ماعملت من خیر محضرا وما عملت من سوء تودلو ان بینها وبینه امدا بعیدا. (سورہ آل عمران آیات ۳۰)

ترجمہ:۔وہ دن جس میں انسان اپنے ہر اچھے کام کو اپنے سامنے حاضر دیکھے گا اور اسی طرح اپنے سامنے ہر بُرے کام کو پائے گا اور وہ خواہش کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کے برے کاموں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہوتا۔

اس آیت سے پوری طرح واضح ہے کہ انسان اپنے نیک کاموں کو محبوب ومطلوب پسندیدہ اشکال میں دیکھے گا اور برے اعمال کو انتہائی بری اشکال میں جن سے اُسے نفرت اور وحشت ہوگی اور وہ ان برے کاموں سے فرار کی خواہش کرے گا لیکن نہ ہی انسان اس جگہ سے

بھاگ سکے گا اور نہ ہی اس کے اعمال اس سے جدا ہوں گے۔ انسانی اعمال کی یہ تصاویر جو اس جہان میں اسے نظر آئیں گی وہ اس کے وجود کا حصہ ہوں گے جن سے جدائی ممکن نہیں ہو گی۔

آیت نمبر۲۔ ووجد واما عملوا حاضراً (سورہ کہف آیت ۴۹)

ترجمہ: جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں انجام دیا ہے اسے اپنے سامنے موجود پائیں گے گذشتہ آیت کی طرح اس آیت کا مفہوم بڑا واضح ہے۔

آیت نمبر۳۔ یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره . (سورہ زلزال آیت ۸،۷)

ترجمہ: اس روز لوگ باہر نکل آئیں گے تا کہ (اعمال کی نمائش گاہ میں) انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں پس ہر ایک آدمی جس نے رائی کے دانے جتنا اچھا کام انجام دیا ہو گا وہ قیامت میں اسے دیکھ لے گا اور ہر شخص جس نے رائی کے دانہ بھر بھی برائی کی ہو گی اسے دیکھ لے گا۔

انسان باقی اور ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس کے اعمال و کردار بھی باقی و محفوظ رہتے ہیں۔ آئندہ زندگی میں انسان انہی افعال و اعمال اور مکتابات و اخلاقیات کے ساتھ زندگی گذارے گا۔ انسان کے لئے یہ مکتابات اور اعمال اس کی زندگی جاوید کا سرمایہ ہوں گے۔

احادیث

کہیں دور سے حضورؐ کے پاس مسلمانوں کی ایک جماعت آئی ہوئی تھی انہوں نے دوران گفتگو خواہش کی کہ رسول پاکؐ انہیں کچھ نصیحت فرمائیں تو جناب نبی کریمؐ نے چند جملے ارشاد فرمائے: جن میں سے ایک یہ ہے ”ابھی سے دوسرے جہان کے لئے اپنے واسطے اچھے دوست اور ساتھیوں کا انتخاب کر لو کیونکہ اس جہان میں ہر ایک کے ساتھ اس کے اپنے اعمال جسمانی صورت اختیار کر کے ہمراہ ہوں گے“۔

ایک مومن شخص اپنی جاویدانی زندگی کے لئے اپنی سوچ، اپنی فکر اور اپنے اعمال و کردار

اس حوالے سے مرتب کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اُس کی آئندہ زندگی میں اس کے کام آئے گا یعنی یوں سمجھیں کہ وہ اپنے اعمال کو قومی بچت کے بینک میں جمع کروا رہا ہے تا کہ وہاں اس جمع شدہ سرمایہ سے خوشحال زندگی بسر کر سکے۔

دنیاوی اور اخروی زندگی میں مشترک و مختلف امور درج ذیل امور پر دونوں زندگیوں میں اشتراک ہے۔

۱۔ یہ دونوں زندگیاں واقعی اور حقیقی زندگیاں ہیں۔

۲۔ دونوں زندگیوں میں انسان اپنی ذات اور اس سے متعلقہ امور سے آگاہ ہوتا ہے۔

۳۔ دونوں زندگیوں میں انسان لذت و تکلیف، خوشی و غم، خوش بختی و بد بختی جیسے محسوسات رکھتا ہے۔

۴۔ انسانی خواہشات خواہ ان کی نوعیت انسانی ہو یا حیوانی دونوں زندگیوں میں ہیں۔

۵۔ دونوں زندگیوں میں انسان اپنے جسم اور انہی اعضاء و جوارح کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

۶۔ دونوں زندگیوں میں فضا اور اجرام فلکی موجود ہیں۔

لیکن ان دونوں زندگیوں میں چند بنیادی اختلافات بھی ہیں۔

وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اس دنیا میں تولید و تناسل، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور موت ہے جبکہ اس دنیا میں نہیں۔

۲۔ اس دنیا میں کام کرو، بیج بوؤ اور موافق حالات فراہم کرو اور اس دنیا میں اس کام کا فائدہ اٹھائیں گے یعنی یہ دنیا بیج بونے اور محنت کرنے کو ہے اور وہ دنیا اس محنت و استعداد کا پھل کھانے کو۔

۳۔ اس دنیا میں انسان اپنی راہیں بدل کر اپنی تقدیر بدلنے کی قدرت رکھتا ہے مگر اس دنیا میں ایسا ممکن نہیں۔

۴۔اس دنیا میں زندگی موت کے ساتھ متصل ہے۔جیسا کہ ایک بیجان مادہ مخصوص شرائط کے ساتھ جانبدار ہوسکتا ہے اسی طور ایک جاندار شے بے جان ہوسکتی ہے لیکن وہاں فقط حیات ہی حیات ہے اس دنیا میں جسم و مادہ، زمین و سما برگ وثمر، باغ وشجر، اعمال واثرات عذاب وثواب سب کچھ جاندار ہے۔

۵۔اس دنیا پر علل واسباب اور زمانے کی مخصوص شرائط لاگو ہوتی ہیں یہاں پر حرکت کا باعث تکامل ہے لیکن وہاں ملکوتی، الوہی اور خدائی ارادہ کا ظہور ہے۔

۶۔وہاں کا شعور وعلم اور حواس ایک دوسرے کے مماثل اور انتہائی مستحکم ہیں بالفاظ دیگر اس دنیا میں انسان کے سامنے سے سب پردے اٹھا دیئے جائیں گے انسان دوراندیش فکر کے ذریعے حقائق کو سمجھے گا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔

فکشفنا عند غطائک .... (سورۃ ق آیت ۱۲)

ترجمہ:۔اب ہم نے تجھ سے پردہ ہٹا لیا ہے پس آج تیری نگاہ تیز ہے۔

۷۔اس دنیا میں تھکان، اکتاہٹ اور افسردگی ہے۔ ہر انسان ایک ایسی کیفیت میں ہے جیسے کسی گمشدہ شے کا متلاشی ہوں۔اور جب بھی کسی شے کو پاتا ہے یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے اپنی متاع گم گشتہ کو پالیا ہے اور اس سے اپنا جی بہلاتا ہے لیکن کچھ ہی مدت بعد اسے خود احساس ہوتا ہے کہ یہ شے اس کا مطلوب ومقصود نہیں تھی اور اس میں افسردگی و یاس جنم لیتی ہے اور وہ اپنی تلاش کو پھر جاری کردیتا ہے یعنی تمام عمر وہ اسی تلاش میں مصروف رہتا ہے بقول اقبال

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

لیکن اخروی زندگی میں ایسا نہیں کیونکہ انسان کی دل کی گہرائیوں اور تحت الشعور میں جو اس کا مطلوب ہے یعنی زندگی جاوید وہ اسے رب العالمین کی ہمسائگی میں میسر آجاتا ہے۔پس

اس کی یاس وافسردگی جاتی رہتی ہے۔قرآن اسی مفہوم کی وضاحت یوں فرماتا ہے

خالدین فیھا لا یبغون.......... (سورہ کہف آیت ۱۰۸)

ترجمہ:۔وہاں انسان (دنیا کے برعکس) ایک نئی حالت کا طلب گار نہیں ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ اہل جنت باوجودیکہ ہمیشہ رہیں گے نہ تو وہ اکتائیں گے نہ ہی دل تنگی محسوس کریں گے،

۸۔اس دنیا میں ہر خواہش حکم خداوندی سے تکمیل کو پہنچے گی وہاں خواہش کی تکمیل کے لئے محنت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

قرآنی دلائل

اس اعتبار سے کہ قیامت پر ہمارا عقیدہ اور ایمان قرآن اور پیغامبران کی رو سے ہے۔ اور ہم پر لازم نہیں کہ ہم قیامت سے متعلق دلائل دیں اور علمی قرآئن وشواہد جمع کریں لیکن چونکہ خود قرآن مجید نے یہ مفہوم ہمارے اذہان پر واضح کرنے کے لئے کچھ دلائل دیئے ہیں اس وجہ سے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی ان قرآنی دلائل کا مختصراً ذکر کریں جو درحقیقت منکرین قیامت کے لئے جوابات ہیں۔ان میں چند دلائل یہ واضح کرتے ہیں کہ قیامت کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔اس قسم کے دلائل اُن لوگوں کے لئے ہیں جو قیامت کو ناممکن خیال کرتے ہیں اور بعض دلائل میں ایک قدم مزید بڑھایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خود اسی کائنات میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو قیامت سے مماثلت رکھتی ہیں اور جن کے مشاہدے سے نظریہ قیامت سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی اور کچھ آیات اس سے بھی آگے ہیں جن میں قیامت کے ہونے کو لازمی امر اور اس کائنات کی حکمت وخلقت کا حتمی نتیجہ کہا گیا ہے اس اعتبار سے جن آیات میں قیامت کے دلائل دیئے گئے ہیں تین اقسام کی بنتی ہیں۔جنہیں ہم ترتیب وار بیان کرتے ہیں۔

سورہ یٰسین آیت ۷۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔

اس نے ہمارے لئے کوئی مثال دے دی اور اپنی خلقت کو بھول گیا اس نے کہا ان

ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔ اے رسول کہہ دیجئے کہ اُن کو وہ ذات زندہ کرے گی جس نے ان کو ابتدائے عمر میں پیدا کیا اور وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے۔

کافروں میں سے ایک بوسیدہ ہڈیوں کو لے کر آیا اور اپنے ہاتھوں میں ان بوسیدہ ہڈیوں کو پیس دیا اور ہوا میں اڑا دیا اور پھر اس کافر نے کہا کہ کون ذات ہے جو ان بکھرے ہوئے ذرات کو زندہ کر دے تو قرآن نے اس کو جواب دیا کہ اس کو وہی ذات زندہ کرے گی جس نے ابتداء میں خود اس شخص کی خلقت کی ہے۔ چنانچہ یہ آیت اس کافر کے سوال کا جواب ہوئی بعض اوقات انسان اپنی توانائی کے مقیاس کے ساتھ اشیاء کو دو حصوں میں منقسم کر دیتا ہے۔

۱۔ جن کا ہونا ممکن ہے ۲۔ جن کا ہونا ناممکن ہے

اور جب وہ کسی شے کو اپنے تصور اور قدرت سے ماوراء پاتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ یہ چیز اپنی ذات کے اعتبار سے ناممکن ہے۔ قرآن مجید کا کہنا ہے کہ اگر اس شے کا قیاس انسانی توانائی سے کیا جائے تو یہ ناممکن ہے لیکن اگر اس کی نسبت اس قدرت کی جانب دی جائے جس نے سب سے پہلے مردہ جسم کو حیات بخشی تو کیا پھر بھی یہ ناممکن ہے؟ ظاہر ہے جب اس کا قیاس اس ذات کی حیثیت سے کیا جائے جس نے سب سے پہلے مردہ جسم کو زندگی عطا کی تو یہ امر سب سے پہلے قابل وقوع ہے۔

قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں قیامت کا تذکرہ قدرت الٰہی کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ ان تمام آیات کا ماحصل یہ ہے کہ قیامت کا واقع ہونا خداوند عادل وحکیم کی مشیت کا تقاضا ہے اور اس کے وقوع میں کسی بھی نوع کی رکاوٹ نہیں ہے جس طرح پہلی بار اس مشیت سے خلقت وحیات کا معجزہ وقوع پذیر ہوا۔ اس نے کائنات، انسان اور زندگی کو خلق کیا تو اسی طرح وہی ذات قیامت میں انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گی۔

نمبر ۲:۔ دوسری نوع کی آیات میں کچھ نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ اور یہ آیات بھی دو حصوں میں

تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(ا) کچھ آیات تو ماضی میں رونما ہونے والے کسی مخصوص واقع کی تشریح کرتی ہیں۔ مثلاً وہ آیات جن میں حضرت ابراہیم کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے آپ کو جواب ملا کہ کیا آپ ایمان نہیں رکھتے۔ آپ نے کہا کیوں نہیں۔ یہ خواہش تو میں نے اپنے اطمینان قلب کے لئے کی ہے۔ آپ سے کہا گیا کہ چار پرندوں کے سر جدا اور جسم ریزہ ریزہ کر کے ہر حصے کو پہاڑ پر رکھ دیں اور پھر پرندوں کو آواز دیں تو آپ دیکھیں گے پرندے زندہ ہو کر آپ کی طرف آئیں گے۔

(ب) وہ آیات جن میں کسی معجزہ یا استثنائی واقعہ کا ذکر نہیں بلکہ وہ واقعات زمین پر موجود و مشہور ہیں۔ جیسے زمین پر موجود گھاس و نباتات مسلسل ہر موسم خزاں میں فنا اور ہر موسم بہار میں زندہ ہو جاتے ہیں اس بات کو ان آیات میں اس طور سے بیان فرمایا گیا ہے کہ جب زندگی شادابی سے مردگی اور افسردگی کی طرف چلی جاتی ہے اور دوبارہ فصل کے بدلنے سے اس کی شرائط بھی بدل جاتی ہیں اور زمین، درخت گھاس اپنی زندگی دوبارہ حاصل کر لیتے ہیں پوری کائنات کا نظام بھی ایسا ہے کہ یہ پورا جہاں خاموشی، سردی اور افسردگی کی طرف چلا جائے گا۔ سورج، چاند، ستارے سب بکھر جائیں گے اور پوری کائنات کے تمام موجودات ایک اور ماحول اور حالت میں از سر نو زندگی حاصل کریں گے۔

وضاحت

ہم لوگ جس زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس پر ۳۶۵ دنوں میں موت اور زندگی کے ادوار آتے ہیں اور ہم پچاس، ساٹھ یا سو سال کی عمر میں اس موت و حیات کے نظام کا کئی مرتبہ نظارہ کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم زمین کے ایک بار فنا ہونے اور پھر دوبارہ زندہ ہونے پر حیران نہیں ہوتے لیکن فرض کریں کہ ہماری عمر بعض کیڑے مکوڑوں کی طرح چند ماہ ہوتی، ہم

پڑھنے لکھنے سے بھی نابلند ہوتے اور ہم کتابوں کے ذریعے زمین کی تاریخ اور ماہ سال کی گردش سے بھی آگاہ نہ ہوتے تو کیونکہ ہم نے زمین پر موت وحیات کے نظام کا خود مشاہدہ نہ کیا ہوتا اس لئے ہم زمین کے فنا کے بعد دوبارہ قیام پر یقین نہ لاتے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ایک کیڑا جو موسم بہار میں پیدا ہوتا ہے اور موسم خزاں اور سرما میں مرجاتا ہے اس کے لئے یہ ماننا محال ہے کہ ایک دفعہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ممکن ہے کیا ایک کیڑا جو کسی درخت کا مکین ہے یا ایک مچھر جو ایک باغ میں رہتا ہے یہ تصور کرسکتا ہے کہ یہ درخت یا یہ باغ ایک عظیم تر نظام کے تابع ہے۔جس کا نام کھیت ہے اور اس کی تقدیر کھیت کی تقدیر سے پیوست ہے اور پھر وہ کھیت بھی ایک اور نظام کے زیر اثر ہے۔جس کا نام شہر ہے اور پھر وہ شہر بھی ایک اور نظام سے مربوط ہے۔جس کا نام صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی ایک اور نظام سے منسلک ہے۔جس کو ملک کہتے ہیں اور ملک نظام ارضی کے تابع ہے اور نظام ارضی خود نظام شمسی کے تابع ہے،ہمیں کیا معلوم کہ یہ ہمارا نظام شمسی،یہ ستارے،یہ کہکشائیں اور سب اشیاء جو نظام طبعی کہلاتے ہیں یہ نظام طبعی کسی اور نظام کے تابع ہو جو اس سے وسیع تر ہو اور ہوسکتا ہے کہ اس نظام طبعی کی کروڑوں اربوں سال کی پوری مدت جو ہمیں معلوم ہے اس وسیع تر نظام کی ایک فصل ایک موسم یا ایک دن کے برابر ہو۔اور یہ جو فصل حیات وزندگی ہے آئندہ فصل سکوت وموت میں بدل جائے جو اس وسیع تر نظام کا موسم خزاں ہو اور پھر وہ وسیع تر نظام جسکا یہ تمام تر نظام جزو وحصہ ہے ایک نئی صورت سے زندگی وحیات کو از سرنو شروع کرے جو اس وسیع تر نظام کا موسم بہار ہو۔

پیغمبرانِ خداوند نے کائنات کی مکمل تباہی و بربادی کے بعد از سرنو قیام زمین کے مُردوں کا ایک نظام نو کے تحت زندہ ہونے کی خبریں منجانب اللہ ہیں اور ہم جب کثیر دلائل کے بعد کائنات کی تباہی و بربادی کے بارے میں ان کے دلائل کی حقانیت کو تسلیم کرچکے ہیں تو ظاہر ہے کائنات کا تباہی و بربادی کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بھی ان ہی کے اقوال میں سے ایک قول

ہے لہٰذا اس پر بھی ہمارا عقیدہ وایمان ہے۔

قرآن نے موت وحیات کے نظام کی وضاحت کے لئے زمین کی مثال اس لئے دی ہے کہ ہم اسے ایک چھوٹے سے نمونے کے طور پر سامنے رکھیں اور اس کے ذریعے ایک وسیع تر حیات کو پہچانیں اور قیامت کے قیام پر شک نہ کریں اور اسے آفرینش کے قوانین سے الگ نہ سمجھیں۔

قرآن کریم فرماتا ہے کہ قیامت تجدید حیات ہے اور اس حیات کی تجدید ہے جس کا ایک حقیر سا نمونہ ہم اس زمین پر دیکھ رہے ہیں۔ حدیث میں ارشاد پیغمبر اکرمؐ ہوتا ہے کہ جب تم بہار کو دیکھو تو قیامت کو بہت یاد کیا کرو یعنی حضورؐ نے قیامت کو بہار سے تشبیہ دی ہے۔

وہ آیات جن میں اس دنیا کی موت وحیات کو مثال بنایا گیا ہے، بہت سی ہیں

واللّٰہ الّذی ارسل الرّیاح فتثیر سحابا فسقنا الی بلدمیت فاحیینا به الارض بعد موتها کذلک النشور (سورہ فاطر آیت ۹)

ترجمہ:۔ خدا وہ ذات ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا انہوں نے بادل کو پھیلا دیا اور اس کے بعد اس بادل کو ہم نے مردہ زمین کی طرف روانہ کیا اور اس وقت ہم نے وہ زمین جو مردہ تھی اسے زندہ کر دیا۔ قیامت میں زندہ ہونا ایسا ہی ہے

وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فاذا اَنْزَلْنَا....... الخ (سورہ حج آیت ۵ تا ۷)

ترجمہ: زمین کو ہم دیکھتے ہیں ایسی حالت میں جب وہ افسردہ، مردہ، بے حس وحرکت ہوتی ہے لیکن جونہی ہم اس پر بارش لائے وہ حرکت میں آ گئی اور اوپر اٹھی اور ہر قسم کا دلکش گھاس اگایا اور یہ اس لئے ہے کہ اس بات کا انحصار فقط اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات حق پر ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت آئے گی اور وہ لوگ جو قبروں میں سوئے ہوئے ہیں ان کو خدا اٹھائے گا۔

اس نوع کی اور بھی بہت سی آیات ہیں کہ جن میں قیامت کو اس دنیا کے موت وحیات سے منسلک قرار دیا گیا ہے۔ مگر ہم انہی دو آیات پر اکتفا کرتے ہیں۔

ان آیات اور پہلی قسم کی آیات میں فرق صرف اس قدر ہے کہ گذشتہ آیات میں گفتگو قدرت خداوندی کے حوالے سے کی گئی ہے کہ جو ذات ابتداء میں زندگی خلق کرتی ہے وہ اس کی دوبارہ خلقت پر بھی قادر ہے۔ لیکن دوسری قسم کی آیات میں قدرت خداوندی کے موجودہ زندگی میں نمونوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

اس نوع کی آیات میں خداوند تبارک وتعالیٰ کی ذات ہی کے حوالے سے قیامت کو امر لازم قرار دیا گیا ہے اور اس کا نہ ہونا محال ہے۔ اس مفہوم کو دو طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک عدل الٰہی۔ یعنی خداوند ہر مخلوق کو اس کے استحقاق واستعداد کے مطابق عطا کرتا ہے۔ دوسرا طریقہ حکمت الٰہی کے حوالے سے کہ پروردگار نے ہر مخلوق کو ایک مقصد اور ہدف کے لئے پیدا کیا ہے اور حکمت الٰہی اسباب کی متقاضی ہے کہ وہ تمام موجودات کو ان کے لائق اور امکانی حد کے اندر کمال تک پہنچائے۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر قیامت حیات جاودانی، سعادت ابدی اور اخروی سزا وجزا نہ ہو تو یہ عدل خداوندی کے خلاف ہے۔ اور ایک طور سے ظلم ہے جبکہ ذات خداوندی سے ارتکاب ظلم ممکن نہیں۔ ایک اور جگہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر حیات جاوید اور اخروی زندگی ثابت وابدی نہ ہو تو یہ ساری خلقت بے کار بے سود ہے اور عبث وبے سود اعمال کا سرزد ہونا خدا سے ممکن نہیں۔ ایسی آیات جن میں عدل وحکمت خداوندی کا سہارا لے کر خدا کی طرف سے زندگی جاوید کو ضروری امر قرار دیا گیا ہے، بہت سی ہیں۔ ہم اس مقام پر دو سورتوں کے دو مقام کا ذکر کرتے ہیں۔ ان دونوں مقامات پر عدل وحکمت خداوندی کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔

نمبر ۱ سورۃ ص آیت ۲۷، ۲۸ میں روز حساب اور اس کے عذاب کے بھولنے کی وجہ سے راہ

خداوندی سے انحراف کرنے والوں کے ذکر کے بعد روزِ حساب اور روزِ قیامت کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے کہ

''ہم نے آسمان وزمین کو بے سود و بے کار نہیں پیدا کیا''

''خلقت کی بیسود پیدائش کی فکر رکھنے والے حقیقت کے مقابلے میں عناد پرست ہیں پس پھٹکار ہے ایسے لوگوں پر جہنم کا عذاب ہے ایسے لوگوں پر کیا ہم ان لوگوں کو جو خدا، قیامت اور پیغمبر پر ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے کام انجام دیئے کیا ہم ان کو تباہ کاروں کی مانند تباہ کردیں گے یا پرہیزگاروں کو فاسق وفاجروں کی طرح قرار دے دیں گے''۔

جیسا کہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے حکیم اور اس کی خلقت کے حکیمانہ ہونے پر دلیل قائم کی گئی ہے جبکہ دوسری آیت میں عدل الٰہی اور اس کی خلقت کے عادلانہ ہونے کا سہارالیا گیا ہے اور اسی مطلب کو سورۃ جاثیہ آیت ۲۲،۲۰ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ

''کیا وہ لوگ جنہوں نے بُرے کام کئے، یہ خیال کرلیا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی مانند بنادیں گے جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے کام کئے جبکہ ان کی زندگی اور مرنا ایک جیسا ہے۔ یہ حکم جو انہوں نے سنایا ہے بہت بُرا ہے''۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان کو برحق پیدا کیا ہے یعنی بے کار وعبث پیدا نہیں کیا اور یہ اس لئے ہے تا کہ ہر ایک اپنے کام کا ثواب وعذاب پالے اور اُن لوگوں پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ان آیات میں پہلی آیت میں عدل الٰہی اور دوسری آیت میں حکمت الٰہی کا سہارالیا گیا اور دوسری آیت کے آخر میں دوبارہ قیامت کو عدل والٰہی کا مقصد قرار دیا گیا۔

وضاحت

یہاں ضروری ہے کہ ہم ان دو بنیادی موضوعات کی قدرے وضاحت کردیں کہ عدل الٰہی حکمت خداوندی کی طرح حیات جاودانی کا تقاضا کرتا ہے اور اگر ہم فرض کرلیں کہ اس محدود حیات کے بعد حیات جاودانی نہ ہو جس میں ہر شخص اپنے دائمی اور حتمی انجام کو پہنچے تو اس طرح انسان اور کائنات کی خلقت عدل الٰہی کے اعتبار سے غیر قابل توجیہ ہے۔

ہم عدل الٰہی سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

عدل الٰہی

عدالت کا حقیقی مفہوم (حق بہ حق دار رسید) ہے اور اس سلسلے میں کوئی تامل وتعصب نہ ہو۔ اگر کسی حق دار کو اس کا حق نہ ملے تو یہ امر خلاف عدالت ہوگا۔ اور اسی طرح اگر عدل میں کوئی امتیاز روا رکھا جائے کہ بعض کو پہلے اور بعض کو نہ ملے تو یہ بھی خلاف عدالت ہوگا۔ مثلاً اگر استاد اپنے طلبہ کو امتحان میں ان کی استعداد و کارکردگی کے مطابق نمبر نہ دے یا بعض طلبہ کو تو ان کے حق کے مطابق نمبر دے دے اور بعض طلبہ کو نہ دے تو ہر دو صورتوں میں وہ استاد خلاف عدالت کا مرتکب ہوگا یعنی حق نہ دینا اور حق دینے میں کوئی امتیاز کرنا دونوں امر خلاف عدالت ہیں۔

ایک لحاظ سے عدالت مساوات کا لازمہ ہے۔ مساوات سے مراد سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھنا اور کسی امتیاز کا قائل نہ ہونا ہے۔ اس نوع کی مساوات عدالت کے لئے ضروری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس کا جس قدر حق ہے اسی قدر اسے دیا جائے نہ تو کسی کو اس کے حق سے زائد دیا جائے اور نہ ہی حق سے کم اور اس اعتبار سے کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جائے لیکن اگر ہم مساوات کو حق کا لحاظ کئے بغیر ہر کسی کو ایک دوسرے کے برابر متصور کریں تو اس نوع کی مساوات بھی خلاف عدالت اور ظلم کا لازمہ ہوگی۔ اسی طرح جب استحقاق کی بنیاد پر ان کے درمیان امتیاز نہ کیا جائے تو ایسی مساوات بھی ظلم ہے لیکن اس ساری بحث کا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عدالت الٰہی کے

معانی یہ ہیں کہ اس دنیا میں جس قدر بھی موجودات ہیں ہر ایک اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اپنے مقام پر فیض خداوندی سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ یعنی ہر موجود کو اس کے استحقاق کے مطابق فیضان ربی پہنچ رہا ہے اور اس میں کوئی بھی کوتاہی نہیں کی جارہی۔ اور اگر کسی موجود کے پاس کوئی شے نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جن شرائط میں موجود ہے اور جن حالات وکیفیات کے تابع ہے اس میں جو شے مفقود ہے وہ اس کی قابلیت وصلاحیت ہی نہیں رکھتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض موجودات کچھ امکانات اور صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئیں مگر وہ جس کمال کی لائق تھیں انہیں وہ نہ ملا تو یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ عدالت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کو ان کے استحقاق کے مطابق فیض جاری کیا جائے۔ تمام موجودات میں سے انسان ایسا ہے کہ جسے مخصوص صلاحیت وقابلیت کا سرمایہ دیا گیا ہے۔ وہ کام اور وہ چیزیں جو اسے کسی کام کو کرنے پر آمادہ کرتی ہیں وہ ان کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ اور یہ فقط وہی چیزیں نہیں ہیں جو حیوان میں بھی ہیں۔ حیوان فقط احساسات وخواہشات کا مالک ہوتا ہے جو اسے طبیعت اور مادی زندگی کے ساتھ مربوط کر دیتی ہیں لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں انسان کو وہ صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں جن کا دنیاوی حساب میں شمار ممکن نہیں یعنی وہ اس سطح سے بلند وبالا جاودانی اور حیات ابدی کے مقام پر ہے۔ یعنی انسان بلند احساسات کا مالک ہے۔ اخلاق، علم، ذوق مذہب اور ایسے بہت سے امور وہ انہی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انجام دیتا ہے اور کبھی اپنی طبعی، مادی اور حیوانی زندگی کو بلند انسانی مقاصد کے لئے قربان کر دیتا ہے قرآنی تعبیر کے مطابق انسان اپنے نظام عمل کو ایمان اور نیک عمل کی بنیاد پر استوار کرتا ہے اور یہ انسان اس نظام عمل کے ذریعے حیات جاوداں اور خوشنودی خدا کا خواہاں ہوتا ہے۔ انسان کے اندر ایک عظیم جاوداں فکر، آرزو اور خواہشات بھی ہیں جو اسے اس جانب چلا رہی ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس انسان میں ہمیشہ باقی رہنے کی صلاحیت وقابلیت موجود ہے۔ باالفاظ دیگر یہ تمام باتیں

انسانی روح کے غیر مادی اور مجرد ہونے کی دلیل ہیں۔ اور انسان کو اس کائنات میں جنین کے حکم میں قرار دیتی ہیں جو رحم مادر میں پرورش پاتا ہے۔ سانس لینے، خون کی گردش، اعصاب، دیکھنے سننے اور تناسل کی مشینوں سے اپنے اندر یہ تمام صلاحیتیں رکھتا ہے لیکن ان تمام امور کا درحقیقت اس نو ماہ کی قلیل زندگی سے قطعاً کوئی ربط و تعلق نہیں اگر چہ یہ تمام حواس آئندہ دنیاوی زندگی میں کام آتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ دنیاوی زندگی میں انسان ایمان اور اعمال صالح سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہ فوائد اس دنیا میں ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایمان اور اعمال صالح ایک بیج کی مثل ہیں جو فقط ایک سعادت مندانہ اور جاوداں حیات میں پھلنے پھولنے کے قابل ہے یعنی یہ اعمال صالح ایک جاوداں زندگی میں اور ایک جاوداں زندگی کے لئے ہی حقیقی مفہوم و معنی رکھتے ہیں۔

انسان نہ صرف ایمان اور عمل صالح کے نظام میں طبیعت سے بالاتر اور مادی تعلقات سے ہٹ کر اس سے بلند مراتب کے لئے بیج بوتا ہے بلکہ ایمان اور اعمال صالح کے برعکس نظام (جسے قرآن نے کفر و فسق کا نام دیا ہے) میں بھی طبعی حیوانی اور جسمانی ضرورتوں اور فطری تعلقات کی حدود سے خارج ہو کر کام کرتا ہے اور انحرافی شکل میں ایک روحانی اور جاودانی پہلو لے لیتا ہے۔ اس وجہ سے وہ بھی ایک قسم کی حیات جاودانی پہلو لے لیتا ہے۔ اس وجہ سے وہ بھی ایک قسم کی حیات جاودانی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن افسوس وہ دکھ و تکلیف حاصل کرتا ہے اور دینی اصطلاح میں وہ اپنے لئے جہنم تیار کرتا ہے۔ انسان اگر ایمان و عمل صالح کے مرکز سے ہٹ جائے تو خود کو حیوانیت کے درجے سے بھی پست لے جائے گا اور قرآن کی رو سے۔

(بل هم أضلّ) یعنی حیوانوں سے پست تر اور گمراہ تر ہو جاتا ہے۔ اب حیات جاودانی کا تصور نہ ہو تو جن افراد نے عمل صالح کے راستے کو اپنایا اور وہ افراد جنہوں نے اس کے برعکس نظام کو اپنایا۔ ان دونوں کی مثال ایسی ہے کہ کچھ شاگردوں نے تو اپنا کام بطریق احسن

انجام دیا ہو اور بعض نے اپنا وقت کھیل کود میں گذار دیا ہو اب اگر استاد دونوں کو نمبروں سے محروم کر دے تو یہ ظلم اور خلاف عدل ہے۔

اس مفہوم کو اس آسان طریق سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالی نے لوگوں کو ایمان لانے اور نیک کام کرنے کی دعوت دی۔ اور اس دعوت کو قبول کرنے کے اعتبار سے لوگ دو گروہوں میں منقسم ہو گئے کچھ نے اسے قبول کیا اور اپنے فکر و اخلاق اور اعمال کو اس کے مطابق ڈھال لیا اور کچھ افراد نے اس دعوت کو مسترد کیا اور فساد و بدکاری میں مشغول ہو گئے۔ اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دنیاوی نظام میں ایسا نہیں ہوتا کہ ۱۰۰ فیصد نیکو کاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا مل جائے بلکہ کچھ نیکوکار جزا کی نوبت سے قبل مر جاتے ہیں یعنی انہیں اس زندگی میں نیک اعمال کی جزا نہیں ملتی۔ پس ایک ایسی دنیا کا ہونا ضروری ہے جہاں نیکو کاروں کو اچھے اعمال کی جزاء اور بدکاروں کو بدکاری کی سزا ملے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ عدل الہی کے خلاف ہے۔

حکمت الہی

انسانوں سے سرزد ہونے والے اعمال دو اقسام کے ہوتے ہیں بعض کام بے سود اور بے کار نوعیت کے ہوتے ہیں جن کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا یعنی ہمارے اندر جس بلند مقام کے حصول کی صلاحیت ہے وہ اس کام کے حصول میں کوئی تاثیر نہیں رکھتے، بالفاظ دیگر اس حقیقی سعادت تک پہنچانے میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور بعض کام ایسے عاقلانہ ہوتے ہیں جن سے مفید نتائج مرتب ہوتے ہیں اور ہمیں حد کمال تک پہنچانے میں معاون و مدد ثابت ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے کاموں کو لغو، باطل، بے فائدہ کام اور دوسری قسم کو اصل حقیقی، بنیادی اور حکیمانہ و عاقلانہ کام کہتے ہیں۔

پس ہمارے عاقلانہ و حکیمانہ کام وہ ہیں جو حکمت کے مطابق ہمیں حد کمال تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن خداوند کے حکیمانہ کام کیسے ہیں؟ کیا خداوند کے حکیمانہ کام ایسے ہیں جو اسے کمال کی

حد تک پہنچائیں اور اس کے لغو اور بے کار کام وہ ہیں جو اسے کمال کی طرف لے جانے میں کوئی کردار ادا نہ کریں۔

ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں! وہ ذات تو غنی و بے نیاز ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے۔ وہ فیض و سخاوت اور بخشش و عطا ہے۔ کوئی بھی کام اپنی کسی حاجت کے زیر اثر کسی نقص کو دور کرنے یا کمال تک پہنچنے کے لئے نہیں کرتا۔ خداوند کے حکیمانہ کام وہ ہیں جو اُس کی مخلوق کو انکی حد کمال تک پہنچائیں۔ خدا کی طرف، عبث، بے ہودہ اور باطل کاموں کی نسبت دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مخلوق پیدا کرے لیکن اس کے استحقاق اور امکان کے مطابق اسے کامل تک نہ پہنچائے یہی وجہ ہے کہ خدا اور انسان دونوں کے حوالے سے حکمت کے مفاہیم مختلف ہیں۔ انسانی حکمت کے معنی یہ ہیں کہ وہ عقلی اور انسانی کمال کے راستے پر قدم رکھے اور حکمت الٰہی سے مراد یہ ہے کہ خداوند مخلوقات کو ان کی لیاقت و قابلیت کے مطابق کمال تک پہنچائے یعنی حکمت خداوندی کے معنی چیزوں کو اس انداز پر پیدا کرتا ہے کہ وہ اہداف و مقاصد اور اپنی حد کمال کی طرف چلیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ انسان کے کام اور اس کے مطلوبہ نتیجہ میں کوئی حقیقی اور واقعی رابطہ و تعلق ہو یعنی وہ کام اصلاً نتیجہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کام کے نتیجہ کو کمال تصور کرلیا جائے۔ ضروری یہ ہے کہ اُس کام کا نتیجہ کمال اور مفاد انسانی میں شمار ہوتا ہو۔ مثلاً انسان مٹی لکڑی پتھر، دھاتوں، چمڑے، اون، ریشم اور روئی وغیرہ سے اپنی ضروریات کی اشیاء بناتا ہے اور ان سے ایک حکیمانہ نتیجہ نکالتا ہے۔ مثلاً کرسی، گھر، موٹر کار یا کپڑے بناتا ہے لیکن کرسی لکڑی کے لئے، گھر پتھر کے لئے کار لوہے کے لئے کمال شمار نہیں ہوگا۔ یہ مواد درحقیقت ان صورتوں اور شکلوں کی طرف حرکت نہیں کرتے لیکن انسان ان سے جو نتائج اخذ کرتا ہے یعنی کرسی پر بیٹھتا ہے، گھر میں رہائش رکھتا ہے کار پر سواری کرتا ہے یہ نتائج انسان کے لئے کمال یا کم از کم نفع بخش ہیں۔

لیکن خدا کے کام اور ان کے نتائج کے درمیان ایک حقیقی اور واقعی رابطہ و تعلق ہوتا ہے

یعنی ہر کار خداوندی کا نتیجہ اور مقصد خود اس کام کا حقیقی کمال ہوتا ہے پروردگار اپنی خلق کردہ ہر شے کو اس کے مقصد کی طرف حرکت دیتا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دانہ اور ہر بیج اپنے مقصد اور کمال کی طرف حرکت میں ہے۔

یہاں اب درپیش مسئلہ یہ ہے کہ دنیا اور فطرت تغیر و تبدل اور عدم و بقا کے مساوی ہے یعنی ہم فطرت میں جو مقصد اور ہدف فرض کرلیں وہ نوبت آنے پر غیر ثابت اور تغیر پذیر ہوگا باالفاظ دیگر ہر شے موقتا اور اختتام پذیر ہے کے فطرت کے تمام مراحل ایک منزل ہیں اور منازل کی خاصیت یہ ہے کہ وہ راستے میں واقع ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کوئی مقصد اور ہدف آخری نہیں ہوتا۔

یہاں بعض لوگوں نے یہ گمان کیا اور نظریہ قائم کیا کہ یہ دنیا اور یہ مخلوقات عبث، بے ہودہ اور بے مقصد پیدا کی گئی ہیں وہ دنیا کو ایک قافلے سے مثال دیتے ہیں جو مسلسل حرکت میں ہے اور اپنی منازل بدلتا رہتا ہے لیکن کبھی اپنے آخری ہدف اور مقصد کو نہیں پہنچ پاتا۔ ہر مقصد اور ہدف ایک منزل ہے طبیعت اسے پیچھے چھوڑتی جاتی ہے اور اپنے سفر کو جاری رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ ایک سفر اسی صورت میں قابل فہم ہوگا کہ جب اُس کی کوئی ایک منزل ہو اور اس منزل کا انتظار ہو اور اگر ہم تمام مقاصد اور اہداف کو فقط چند منازل کہیں جہاں پہنچنا مقصد نہ ہو تو ظاہر ہے یہ سفر اور قافلہ سوائے بے ہودگی و بے فائدہ اور باطل و عبث کے اور کچھ نہیں۔

اگر یہ بات طے ہے کہ ہر آبادی کے بعد بربادی اور ہر ہستی کے بعد نیستی کو آنا ہے۔ تو پھر جو کچھ اس کائنات پر حاکم ہے وہ سوائے سرگردانگی اشیاء و افعال کے تکرار اور ایک شے کے بار بار آنے کے علاوہ اور کچھ نہیں پس جو ہستی ہے وہ باطل و بیہودگی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔

اب جو قرآن کہتا ہے یہ درست ہے کہ اگر فقط دنیا اور طبیعت کی بات ہوتی اگر تمام پیدا ہونے والے مرنے کے لئے، تمام اُگنے والے، سرسبز ہونے اور شگوفے کھلانے والے خراب

ہونے کیلئے اور تمام نئے پرانا ہونے کے لئے ہوتے تو اس اشکال کی گنجائش ہوتی لیکن اس قسم کے نظریات ناقص فکر کی پیداوار ہیں اور اس کی وجہ پیدائش اس صورت میں ہے کہ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ سب دنیا اور طبیعت کے اندر محدود و محصور ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ دنیا روز اول ہے اور اس کا ایک روز آخری بھی ہے دنیا کو جانا ہے اور آخرت کو آنا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

الدّنیا دار مجاز والا خرة دار قرار

دنیا گذرنے کا اور آخرت ٹھہرنے کا گھر ہے۔

یہ آخرت ہے جو دنیا کو معنی عطا کرتی ہے کیونکہ مقصد ہی کسی حرکت کو معنی و مفہوم بخشتا ہے۔ اگر جہان آخرت جو جہان جاودانی ہے نہ ہوتا اور اس جہان کا ایک ایسا حقیقی اور واقعی مقصد نہ ہوتا جس پر تمام مقاصد آکر ختم ہوجاتے تو گردش روزگار ایک قسم کی سرگردانی ہوتی جو قرآنی اصطلاح کے مطابق عبث باطل، لہو ولعب ہوتی لیکن پیامبران اسی اشتباہ کی روک تھام کے لئے آئے تاکہ ہمیں ایسی حقیقت سے آگاہ کریں جسے جانے بغیر یہ ہستی ہمیں بے ہودہ و باطل نظر آئے اور ہمارے اذہان میں یہ نظریہ راسخ ہوجائے۔ جب یہ مفہوم ہمارے دماغ میں سرایت کرجائے یعنی اس بے ہودہ اور باطل سوچ کی بناء پر ہم ایک بے معنی بے فائدہ اور بے کار صورت میں ہوجائیں ایسے میں آخرت پر ایمان لانے کے اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ عقیدہ ہمیں بیہودہ و بے کار ہونے کے گمان سے نجات دلاتا ہے۔ اور ہمیں، ہماری سوچ اور ہماری ہستی کو معنی و مفہوم عطا کرتا ہے۔



قائد انقلاب اسلامی: آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے واقعہ کربلا پر بصیرت افروز خطاب

فلسفہ عزاداری
قیام امام حسینؑ کے اسباب
درس کربلا
عبرت ہائے عاشورہ

شہید راہ اسلام استاد مرتضیٰ مطہری کے معارف اسلام پر بصیرت افروز خطاب

ہجرت و جہاد
شہید
حیات جاوید
ختم نبوت
بیسویں صدی کی اسلامی تحریکیں

ڈاکٹر علی شریعتی
خودسازی

استاد آیت اللہ جوادآملی
قرآن اور ہدایت

ہماری جدوجہد کا مقصد

امام حسینؑ نے فرمایا:

بارالہا! تو جانتا ہے کہ ہماری جدوجہد کا مقصد نہ تو حصول اقتدار کے سلسلے میں رسہ کشی ہے اور نہ ہی یہ مال دنیا میں اضافے کی خواہش کیلئے ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ:

☆ تیرے دین کی نشانیوں کو آشکار کردیں۔

☆ تیرے شہروں میں اصلاح کریں۔

☆ تیرے مظلوم بندوں کو امان میسر ہو۔

☆ اور جو فرائض، قوانین اور احکام تو نے معین کیے ہیں ان پر عمل ہو۔



محمدؐ و آل محمدؐ کی الہی و سیاسی تعلیمات کے فروغ و احیاء کیلئے سرگرم عمل۔

اتحاد بین المسلمین و استحکام وطن کے لیے مصروف عمل

منتظرین امام زمانؑ

دانش گاہ علوم اسلامی

"خداوندہ! ہر مصیبت کے وقت مجھے تجھ ہی پر بھروسہ ہے اور ہر سختی میں تجھ ہی سے اُمید ہے ہر مشکل میں تو ہی میرا چارہ ساز اور سہارا رہ ہے میں نے کتنی ہی ایسی پریشانیوں میں جن سے دل ڈوبنے لگتا ہے جن کا کوئی علاج نظر نہیں آتا جن میں دوست ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور دشمن مذاق اُڑاتے ہیں سب کو چھوڑ کر تجھ سے مدد مانگی تو تو نے مجھے تسکین اور راحت بخشی اور ان پریشانیوں کو دور کر دیا ہر نعمت اور ہر نیکی تیری ہی طرف سے ہے اور سب کچھ تجھ ہی سے مانگنا چاہئے۔"

(حضرت امام حسین علیہ السلام)

